چند نئی مصری مطبوعات

از جناب مولانا مسعود عالم ندوی

(قسط دوم)

(۵) العدالة الاجتماعية فی الاسلام مصنفہ سید قطب۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ، بڑی تقطیع، ۲۷۰ صفحے۔ (اسلام میں اجتماعی عدل)[1]

یہ کتاب اور اس کا موضوع بحث، محمد الغزالی کی کتابوں اور ان کے موضوع بحث سے ملتے جلتے ہیں مگر دونوں مصنفوں کی شخصیتوں میں بڑا فرق ہے۔ الغزالی، ازہر کے عالم اور قدیم طرز کے تعلیم و تربیت یافتہ ہیں۔ غالباً یورپ کی کوئی زبان وہ نہیں جانتے۔ قدیم تعلیم اور قرآن و حدیث کے مطالعہ کے باعث، مزاج میں اعتدال طبیعت میں رزانت اور لہجے میں نرمی ہے۔ ان کے برعکس، زیر نظر کتاب کے مصنف سید قطب، جامعۂ فواد کے گریجویٹ، "امریکا پلٹ" اور مصر کے نئے لکھنے والوں میں امتیاز و شہرت کے مالک ہیں۔ الاخوان المسلمون، یا کسی اور مذہبی انجمن سے ان کا کوئی باضابطہ تعلق نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نے خود انہیں اپنی طرف کھینچا اور آہستہ آہستہ یہ حقیقی اسلام کے مبلغ اور اسلامی تحریک کے داعی بن گئے۔ لیکن چونکہ ان کا یہ جوش و خروش کسی مدرسہ یا دار العلوم کا مرہونِ منت نہیں، اور نہ ان کے دل میں علمائے کرام کا کوئی روایتی احترام ہی ہے، اس لئے قدرتی طور پر خامیوں اور غلطیوں پر ان کی تنقید سخت اور تلخ ہوتی ہے۔

کتاب کا موضوع "اجتماعی عدل" سے متعلق اسلام کی تعلیم، پروگرام، اور اس کے ارکان و وسائل سے

[1] ہمارے سامنے اس وقت کتاب کا دوسرا منقح ایڈیشن ہے، جو مصنف نے پچھلے دنوں امریکا سے واپسی پر شائع کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن، بغداد میں راقم کی نظر سے گذر چکا تھا۔ اس ایڈیشن میں مفید اضافے ہیں۔ امریکا کی ایک علمی سوسائٹی اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر رہی ہے۔

بحث کرتا ہے۔ مصنف کو اسلام اور اس کی تقدیر (Destiny) اور روشن مستقبل پر یقین کامل ہے کمیونزم اور جمہوریت، دونوں سے وہ نالاں ہیں۔ ان کی نگاہ میں دونوں مادہ پرست اور دین اور دینی فکر کے دشمن ہیں۔ روس اور امریکا کی باہمی رسہ کشی، جنگِ زرگری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ (ص ۲۶۳)۔

کتاب کے اہم ابواب یہ ہیں:-

(۱) مسیحیت اور اسلام میں دین اور سوسائٹی کی حیثیت۔

(۲) اسلام میں اجتماعی عدل کا مزاج

(۳) اسلام میں اجتماعی عدل کے ارکان۔ (الف) قلب و روح کی آزادی۔ (ب) انسانی مساوات (ج) اجتماعی تضامن و تکافل۔

(۴) اسلام میں اجتماعی عدل کے وسائل۔

(۵) اسلام میں حکومت کا نظام۔ (الف) مالی پالیسی (ب) انفرادی ملکیت (ج) زکوٰۃ کی فرضیت

(۶) زکوٰۃ کے علاوہ مال میں دوسرے حقوق

(۷) اسلام کی تاریخ سے چند مثالیں۔

(۸) اسلام کا حاضر اور مستقبل

(۹) دوراہے پر

تبصرہ نگار کی نگاہ انتخاب حیران ہے کہ ایسی مفید اور جامع کتاب کا کون سا پہلو نمایاں کرے اور کسے نظر انداز کرے؟ ایک مختصر تبصرے کی محدود گنجائش میں طول طویل اقتباسات دینا مشکل ہے مجبوری میں مصنف کے بعض افکار و رجحانات ہی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

پہلے باب میں فاضل مؤلف نے اسلام اور مسیحیت کا فرق بڑی خوبی سے واضح کیا ہے: "مسیح علیہ السلام نے اجتماعی یا سیاسی نظام کے متعلق صرف سرسری اشارے فرمائے ہیں۔ مسیحیت نے قیصر کا قیصر کو دیا اور اللہ کا اللہ کو۔ اس کی بنیاد اس تصور پر اٹھائی گئی کہ دین صرف رب اور بندے کے درمیان ایک رابطے کا نام ہے، جس طرح قانون عبارت ہے، حکومت اور فرد کے باہمی تعلق سے۔"

لیکن اسلام کا حال اس سے مختلف ہے :-

"دین کا ایک مجموعہ ہے، جس کا تجزیہ نہیں ہوسکتا (کُلٌّ لا تیجزی)

"عبادت و معاملات و قوانین و ہدایات ــــ دین سب کے مجموعے کا نام ہے تعبدی شعائر اپنی فطرت و عنایت میں سیاسی نظام اور معاملات سے الگ نہیں" (ص۱۳)

دوسرے باب میں اسلام کے تصورِ کائنات پر گفتگو کرتے ہوئے، "اسلامی فلسفہ" کے متعلق مؤلف نے پتے کی بات کہی ہے، جس سے ان کی ژرف نگاہی کا پتہ چلتا ہے :-

"ابن سینا یا ابن رشد اور ان جیسوں کے ہاں جنہیں 'فلاسفۃ الاسلام' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، صحیح اسلامی فلسفہ کی تلاش بے سود ہے۔ ان کا فلسفہ یونانی فلسفہ کا عکس ہے، جسے حقیقت میں اسلام سے کوئی واسطہ نہیں" (ص۲۲)

اس سلسلے میں مصنف کو علمائے ازہر سے بھی سخت شکایت ہے :-

"اسلام کے تصورِ حیات کی تشریح اور دوسرے نظامہائے حیات پر اس کے نظامِ حیات کی برتری ثابت کرنے کے بجائے، کلیتہ اصول الدین میں ابن سینا اور ابن رشد کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یونانی فلسفے کی نقالی و ترجمانی کو بے جا طور پر اسلامی فلسفہ کا نام دے دیا گیا ہے" (ص۲۴)

تیسرے باب سے لے کر چھٹے باب (ص۳۲-۱۴۲) تک مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے ہاں کوئی نئی چیز نہیں، لیکن مصر اور عربی بولنے والے علاقوں میں ابھی ضرورت ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت، اجتماعی عدل، مالی پالیسی اور متعلقہ مسائل پر بار بار اور تفصیل سے لکھا جائے۔ مصنف نے یہ فرض بڑی قابلیت اور جامعیت کے ساتھ ادا کیا ہے۔ کسی مصنف و مفکر کے تمام خیالات سے اتفاق کرنا تو ذرا مشکل ہے، البتہ اس بات کی شہادت دی جاسکتی ہے کہ مصنف کی صائبِ فکر اور ان کے جذبۂ دعوت کا پڑھنے والے پر خاص اثر پڑتا ہے۔ شخصی ملکیت پر پابندیاں، مال پر زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے واجبات، کنز اور اس کی مقدار، اور اسی طرح کے دوسرے مسائل میں کافی گفتگو اور کسر و انکسار کی گنجائش

ہے۔ اور یہ کام ایک فرد کے کرنے کا ہے بھی نہیں۔ مصر میں یا ہمارے ہاں جو اصحاب علم ان مسئلوں پر لکھتے ہیں، وہ گویا آئندہ منظم کام کے لیے مواد خام اور مسالہ فراہم کر رہے ہیں۔

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے حقوق بھی ہیں:۔ اس پر مؤلف نے مفصل گفتگو کی ہے (ص ۱۳۶-۱۴۰) زکوٰۃ کو اسلام کا آخری مطالبہ کہنا مصنف کے خیال میں، پیشہ ور علمائے دین (رجال الدین المحترفین) کی ایجاد ہے:۔

"جب جماعت کو زکوٰۃ کے علاوہ دوسری آمدنی کی ضرورت نہ ہو، تو زکوٰۃ "کم سے کم مطالبے" کے طور پر واجب ہے۔ لیکن اگر زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو، تو اسلام بے بس نہیں۔ وہ صاحب امر کو کافی اختیارات دیتا ہے۔ اصلاح کی لازمی حدود کے اندر وہ قوم کے سرمایہ سے مناسب مقداریں لے سکتا ہے" (ص ۱۳۶)

مصنف نے اس سلسلے میں فقہی مصالح مرسلہ اور سدِ ذرائع پر مفصل گفتگو کی ہے اور محمد ابو زہرہ کی کتاب "الامام مالک" سے طویل اقتباسات دیئے ہیں۔ ائمہ اربعہ میں امام مالک ہی مصالح مرسلہ کے باب میں مستقل رائے رکھتے اور نص نہ ہونے کی صورت میں اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس باب میں وہ مبتدع نہیں، بلکہ ان کے پاس دلائل و شواہد ہیں۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اور خاص طور پر عہد فاروقی کی متعدد مثالیں محمد ابو زہرہ نے دی ہیں۔ مصالح مرسلہ کے ماتحت، صاحب امر کو جو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، اس کی ایک مثال ذیل میں درج ہے، جو مصنف نے محمد ابو زہرہ کی کتاب "الامام مالک" سے نقل کی ہے:

"عام ملکی مسائل میں مصلحت کے مؤثر ہونے کی ایک مثال یہ ہے کہ "جب بیت المال خالی ہو، یا فوج کی ضروریات بڑھ جائیں، اور بیت المال کا ذخیرہ کافی نہ ہو، تو امام کو حق حاصل ہے کہ وہ مالداروں پر اتنی رقم عائد کر سکتا ہے، جو اس کے خیال میں فوری طور پر ضروریات کے لیے کافی ہو۔ . . . . . پھر اسے یہ بھی اختیار ہے کہ یہ ٹیکس فصل کی تیاری اور پھلوں کے پکنے کے وقت عائد کرے، تاکہ اصحاب ثروت کی دل آزاری نہ ہو۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ اگر امام عادل ایسا نہ کرے، تو اس کا رعب و وقار ختم اور ملک دشمنوں کے حملوں کی

آماجگاہ بن جائے گا ۔۔۔ ممکن ہے، یہ کہا جائے کہ ٹیکس عائد کرنے کے بجائے امام بیت المال کے لیے قرض بھی لے سکتا ہے ؛ اس کا جواب امام شاطبی نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ "بحران (ازمۃ Crisis) کے عالم میں قرض اس وقت لیا جاتا ہے جب بیت المال میں آمدنی کی توقع ہو۔ لیکن جب کوئی فوری (توقع نہ ہو، اور آمدنی کے تمام ذرائع ناکام ثابت ہوں، تو پھر کوئی رقم مشخص کرنے (توظیف) کے سوا چارہ کار نہیں" (ص ۱۳۹)

اسی طرح "سد ذرائع" بھی ایک معتبر فقہی اصل ہے۔ امام ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں آثار صحابہ سے اس کی بیسیوں نظیریں پیش کی ہیں۔ مؤلف کے خیال میں مصالح مرسلہ اور سد ذرائع کے اصولوں کے ماتحت سوسائٹی کی تمام معاشی مشکلات حل کی جاسکتی ہیں۔ طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ اس کی مثالیں دی جاتیں۔

ساتواں باب (اسلام کی تاریخ سے چند مثالیں) کتاب کا سب سے طویل اور اہم باب ہے اس میں مولف نے اسلام کی تاریخ اور فکری تغیرات کا جائزہ لیا ہے اور شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے عہد خلافت سے لے کر دورِ حاضر تک کی فکری اور عملی تبدیلیوں پر نظر ڈالی ہے۔ مصنف نے جائزے میں لگی لپٹی نہیں رکھی۔ جو کوئی اسلامی روح کا پیکر اور اس کی اصلی خصوصیات کا حامل نظر آیا۔ اس کے حق میں کلمہ خیر سے بخل نہیں کیا گیا۔ اور جو اس راہ سے ہٹا ہوا دکھائی دیا اُس پر نقد کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس ہوئی۔ جدید تعلیم اور جوشِ جوانی کے باعث ان کا قلم روایتی احترام و عقیدت کا بھی شرمندۂ احسان نہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر بنوامیہ اور خاص کر امیر معاویہ پر انتہائی سخت اور تلخ لہجے میں تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلامی سیاست سے اخلاق کا عنصر خارج کرنے کی کوشش کی۔ ابوسفیان اور ہند کا اسلام بھی مصنف کے نزدیک مجبوری کے اقرار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور تو اور حضرت عثمانؓ بھی مصنف کی تلخ بیانی سے نہیں بچ سکے ہیں۔ ان کی کوتاہیوں کے لیے عذر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر معاف کرنے کے لیے تیار نہیں :۔

"یہ مشکل ہے کہ ہم حضرت عثمانؓ کی اسلامی روح کو متہم کریں۔ لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ ہم

انہیں اس غلطی سے بھی بری الذمہ قرار دیں۔ بڑھاپے میں ان کا زمام خلافت ہاتھ میں لینا، اور بدباطن بنو امیہ کے بداخلاق لوگوں کا ان پر چھا جانا، کوئی معمولی غلطی یا سوء اتفاق نہیں" (صفحہ ۱۸۹) بیت المال میں حضرت عثمانؓ کے سوء تصرف کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ یوں تو حضرت عثمانؓ کے باب میں ان کا پورا بیان اور طرز تنقید ہمارے نزدیک ناپسندیدہ ہے لیکن عہد عثمانی کے فتنوں کو "روح اسلام سے قریب" بتانا (صفحہ ۱۹۰) حد درجہ تکلیف دہ اور افسوسناک ہے۔ فتنہ پردازوں کی شرارتوں سے مؤلف کو انکار نہیں، لیکن وہ ان کے طرز عمل کو مروان اور بنو امیہ کے طرز عمل کی نسبت اسلام سے زیادہ قریب قرار دیتے ہیں۔ اسلام کا یہ پہلا فتنہ تھا۔ اس کی جتنی مذمت کی جائے، کم ہے۔ مروان، امیر معاویہ اور یزید کی وکالت کرنا مقصود نہیں، مگر وہ فتنہ، جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کا باعث ہوا، اس کی تحسین و تائید یا اس کی مدت میں کوتاہی ایک مسلمان کے بس کی بات نہیں ـــــ کتاب میں سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہمیں یہی نظر آئی انشاء اللہ ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے گی۔

کتاب میں چھوٹی موٹی خامیاں اور بھی ہیں۔ اور کون مصنف اس سے خالی ہو سکتا ہے؛ طول کلام کے خوف سے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب بہت مفید، جامع اور وقت کی چیز ہے۔ اللہ کی شان دیکھئے۔ ازہر کے شیوخ تو اپنی تنخواہوں اور گریڈ کی خیر منانے میں سرگرم ہوں، اور دین کی خدمت نئے گریجویٹوں کے حصے میں آئے۔ یہی تضاد ہے جس نے ازہر اور شیوخ ازہر کے باب میں مصنف کا لہجہ بہت تلخ و تند کر دیا ہے۔

کتاب کی زبان اور اسلوب بالکل اپ ٹوڈیٹ اور نوجوانوں میں مقبول ہے۔ تبصرہ نگار عربی زبان و انشا میں بھی اعتدال پسند مسلک رکھتا ہے۔ وہ قرآنی زبان اور معیاری اسلوب بیان سے انحراف پسند نہیں کرتا۔ لیکن ایک عجمی کی پسند و ناپسند کیا حیثیت رکھتی ہے، جب کہ عربی کے بڑے بڑے مرکزوں میں بھی معیاری زبان لکھنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔

معركة الاسلام والراسمالية (اسلام اور سرمایہ داری کی جنگ)	مصنفہ سید قطب، ۱۰۸ صفحے، طباعت اور کاغذ غنیمت۔ یہ جدید مصر کے روشناس اہل قلم، سید قطب کی

تازہ تصنیف اور مصر کی موجودہ صورتِ حال اور اس کے حامیوں کے لیے دعوتِ مبارزت اور کھلا چیلنج ہے۔ کتاب اول سے آخر تک داعیانہ جوش و خروش کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اُن کے لیے جن کے ہاتھوں میں مصری سیاسیات کی باگ ہے، اور اُن کے لیے جو مصر کی دولت و ثروت سے نفع اندوز ہو رہے ہیں، اور اُن کے لیے جو دین کی نمائندگی کے دعویدار اور سرکاری حلقوں میں اس کے ترجمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان سب کے لیے کھلا چیلنج ہے۔ مصنف کا کہنا یہ ہے کہ "ملک کی موجودہ معاشی و معاشرتی حالت عوام کو شیوعیت، (کمیونزم) کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اگر اس کا جلد سے جلد تدارک نہ کیا گیا، تو صورتِ حال خطرناک ہو جائے گی اور اس کا وبال سیاست کاروں، سرمایہ داروں اور دین کے غلط اور خود ساختہ اجارہ داروں پر عائد ہوگا۔" مصنف نے "اِنِّی اَتَّھِمُ" (میں مجرم قرار دیتا ہوں) کے زیرِ عنوان ملک کے ایک ایک گروہ کو للکارا ہے اور ان کی خامیاں اور کوتاہیاں ان کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں اور اس سلسلے میں ایسی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے جنہیں پڑھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

مصری سوسائٹی میں اخلاقی انحطاط کس حد تک پہنچ گیا ہے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"میں مجرم قرار دیتا ہوں ، ہاں! میں موجودہ معاشرتی صورتِ حال کو اس بات کا مجرم قرار دیتا ہوں کہ کوشش، اور بدلہ کے درمیان، توازن، و تناسب کی حیثیت افسانہ سے زیادہ نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ افراد اور جماعتوں میں روز بروز بے اطمینانی پھیل رہی ہے۔ اس میں ہر فرد کے لیے ترقی کے یکساں مواقع ملنا ناممکن ہیں۔ مصر میں یہ کافی ہے کہ لڑکا طفل، چھانٹ کر اچھے والدین کے ہاں پیدا ہو تاکہ ترقی کی ہر ممکن راہ اس کے سامنے کھلی ہوئی ہو، اور وہ راہ کی دشواریوں کو اچھلتا پھاندتا طے کرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ اور اگر وہ والدین کا معقول انتخاب نہ کر سکا ہو، تو کم سے کم ایسی بیوی تلاش کرے، جس نے والدین کا اچھا انتخاب کیا ہو اور کسی وزیر یا مالدار آدمی کے گھر پیدا ہوئی ہو، تاکہ شوہر کو اپنے بازوؤں پر لے کر اُڑ جائے۔ اور اگر بیوی بھی والدین کا معقول انتخاب نہ کر سکی ہو، تو پھر اس نے اپنے چہرے کا رنگ و روغن ہی درست کر رکھا ہو (قَدْ اَحْسَنَتْ اِخْتِیَارَ تَقَاطِیْعِھَا وَمَلَامِحِھَا)۔ اور وہ تو ننگا ہے جس سے

تمام عقدے حل ہو جاتے ہیں اور وہ شخص جس طرح چاہے اسے لے کر حکام کے پاس آ جا سکتا ہے ۔۔۔۔ (صفحہ ۲-۱۹)

یہ ہے مصر کی موجودہ معاشرت اور ارباب حکومت کا اخلاق جس کے خلاف جواں سال مصنف نے علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔

مصر کے ایک روشناس شاعر محمود ابوالوفا کا ایک مزاحیہ قطعہ بھی اس سلسلے میں سن لیجیے مصنف کا کہنا ہے کہ یہ مذاق نہیں تلخ حقیقت ہے، جو ظرافت کے رنگ میں شاعر کی زبان پر آ گئی ہے:-

أَخِيْ! قُلْ لِيْ وَلَا تَخْجَلْ　　　بِمَاذَا قَدْ تَرَقَّيْتَا؟

میرے دوست سچ کہنا شرم کی ضرورت نہیں تم نے یہ ترقی کس طرح حاصل کی؟

وَمَا أَنْتَ بِذِيْ جَاهٍ　　　وَعُمْرَكَ مَا تَزَوَّجْتَا

نہ صاحب جاہ و ثروت تھے۔ اور نہ تم نے زندگی بھر شادی ہی کی!!

اللہ اکبر! یہ حالات کہاں نہیں ہیں؟ اللہ کا قانون عدل اندھا بہرا نہیں۔ قوموں کی تباہی یونہی نہیں ہوا کرتی۔ خوش نصیب ہیں، جو وقت آنے سے پہلے خبردار ہو جائیں۔

مصنف نے اس سلسلے میں علمائے ازہر کو خوب خوب سنائی ہیں "بداخلاقیوں اور فواحش کے سیلاب کے خلاف تو علمائے کرام گاہے گاہے بادشاہ سلامت اور وزیر اعظم کی خدمت میں عریضہ گذران دیتے ہیں، لیکن معاشی استحصال اور کسانوں پر جور و ظلم کے خلاف کبھی ان کی زبان نہیں کھلتی۔ یہ بات کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سے ان کے حلوے مانڈے میں فرق آنے کا اندیشہ ہو" (صفحہ ۱۹)

علمائے ازہر کے تصورِ دین پر بھی مؤلف نے جا بجا سخت تنقید کی ہے (صفحہ ۷۶، ۸۰، ۱۲۹، ۱۳۳)، نیز "علماء" اور "رجال دین" کی طبقہ واری اجارہ داری کی سخت مخالفت کی ہے:-

"علماء اور صوفیوں کے لباس کا بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ لباس میں اسلامی اور غیر اسلامی کی تفریق نہیں۔ اسلام نے انسانوں کے لیے کوئی لباس مقرر نہیں کیا بلکہ لباس

ایک مقامی اور ملکی مسئلہ ہے۔ تاریخ و روایات سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جبہ اور قفطان تو زیب تن نہیں فرمائے تھے . . . . .

آخر ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے لباس میں کیوں ممتاز ہو؟ اسلام میں "رجال دین" کا کوئی منصب نہیں۔ اور نہ یہاں اہل کلیسا کا کوئی خاص طبقہ ہے جس کے توسط کے بغیر مذہبی شعائر ادا نہیں ہو سکتے۔" (ص ۸۹)

اسی طرح مصر کے موجودہ معاشی نظام کی خرابیوں اور سیاسی پارٹیوں کی اخلاقی کمزوریوں کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ مصنف کی رائے ہیں سیاسی پارٹیوں کے باہمی اختلافات صرف وزارتوں اور پارلیمنٹ کی نشستوں کے لیے ہیں غریبوں اور مصیبت زدہ طبقوں کے مقابلے میں سب ایک ہیں[۱]۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ پرجوش مصنف کے نزدیک ان تمام خرابیوں کا حل "اسلام" ہے اور اسی لیے وہ بار بار اسلامی نظام حکومت کی برملا دعوت دیتا ہے اور اپنے ہم وطن غفلت کے ماروں کو متنبہ کرتا ہوا کہتا ہے :" اب بھی ہوشیار ہو جاؤ۔ اگر اسلام کو اختیار نہیں کرتے، تو پھر کمیونزم کی فتنہ سامانیاں تمہیں تباہ کر کے رہیں گی۔ یہ غیر فطری صورت حال دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔"

مزید اطمینان کی چیز یہ ہے کہ ابھی مصنف کا آغاز سفر ہے۔ توقع ہے کہ مستقبل قریب میں ان کے قلم سے اور مفید کتابیں نکلیں گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعتدال اور حسن عمل کی توفیق دے۔ ہماری بہترین توقعات ان سے وابستہ ہیں۔ محمد الغزالی اور ان کے رفقاء کی تالیفات نوجوان طبقوں میں اتنی مقبول اور مؤثر نہیں ہو سکتیں جتنی سید قطب جیسے جدید طرز کے مردشناس ادیب کی۔

(۷) (الف) اسمعي يا مصر ! (اے مصر! سن!!)، چھوٹی تقطیع، ۱۵ صفحے۔

(ب) الدعوة الاسلامية وتطورها في الهند (ہندوستان میں اسلامی دعوت اور اس کی عہد بہ عہد تبدیلیاں) متوسط تقطیع، ۳۲ صفحے۔

(ج) أريد أن أتحدث إلى الإخوان (میں اخوان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں)، چھوٹی تقطیع۔ ۲۹ صفحے۔

[۱] ملاحظہ مصر کا بیاس۔

(د) شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال۔ چھوٹی تقطیع، ۸۰ صفحے۔

(ھ) المد والجزر فی تاریخ الاسلام۔ متوسط تقطیع، ۴۶ صفحے۔

طباعت اور کاغذ مصری مطبوعات کی روایات کے مطابق قیمتیں درج نہیں۔ شاید مکتبۂ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ سے مل سکیں۔ یہ پانچ چھوٹے بڑے پمفلٹ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ مصنف اپنی تبلیغی مہم کے سلسلے میں ایک عرصے سے عرب ملکوں کے دورے پر ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے جابجا خطبے بھی ارشاد فرمائے ہیں۔ زیرِ نظر رسالے مصر کے دوران قیام میں لکھے گئے اور وہیں سے چھپ کر شائع ہوئے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے مصری مطبوعات کے ضمن میں ان کا تعارف کرایا جارہا ہے۔

(الف) پہلا پمفلٹ ایک مقالے کے طور پر، قاہرہ کے مشہور ادبی ہفتہ وار رسالہ (الرسالہ) میں شائع ہوچکا ہے۔ اس میں مصر کو اس کی مرکزی حیثیت اور اس کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ باتیں اچھی اور دردمندی کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ مگر جس حلقے کا انتخاب کیا گیا ہے، وہاں اس قسم کی سنجیدہ باتوں پر کان دھرنے والے بہت کم ہیں۔

(ب) دوسرا پمفلٹ موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس میں مصنف نے ہندوستان میں اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ مگر افسوس کہ سید شہیدؒ کی دعوت تجدید و جہاد کے بعد وہ تحریک کی صحیح تاریخ نہیں بیان کرسکے ہیں۔ مشہد بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کے بعد ملک کے طول و عرض میں سید شہیدؒ کے ماننے والوں، ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں، اور ان کے مشن کی خاطر گھربار لٹانے والوں نے جو خدمات انجام دیں، ان کا اس میں کہیں ذکر نہیں۔ کم سے کم سیرت سید احمد شہیدؒ کے مصنف سے ان کے نیازمند ایسی توقع نہیں رکھتے تھے۔ مزید برآں، دیوبند، ندوہ اور مدیر رسالہ ترجمان القرآن کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید مصنف کے نزدیک ایک تعلیمی و تہذیبی تحریک اور اقامتِ دین کی ہمہ گیر دعوت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ آخر میں مولانا محمد الیاس مرحوم کی دعوت و تبلیغ اور ان کی جاذب شخصیت اور ذاتی خصوصیات کا ایک گونہ مفصل اور مؤثر

تذکرہ ہے۔ ہندوستان کی مسلم حکومتوں کو مصنف نے بار بار اسلامی ریاست (الدولۃ الاسلامیہ) اور اسلامی حکومت (الحکومۃ الاسلامیہ) کے نام سے یاد کیا ہے، جو صحیح نہیں۔ غالباً یہ سہوِ قلم کا نتیجہ ہے۔

رسالہ کے آغاز میں مصر کے مشہور مسلمان صاحبِ قلم، سید محب الدین خطیب نے مصنف کا تعارف کرایا ہے۔ اس مختصر "تعارف نامہ" میں ان کی "ندویت" کی مناسبت سے ان کے اور ہمارے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی اور استاذ الاستاذ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا ذکر بھی آگیا ہے، اور بڑی محبت اور احترام کے لہجے میں۔

(ج) تیسرے پمفلٹ میں مصنف نے الاخوان المسلمون والوں سے باتیں کی ہیں۔ یہ باتیں اچھی، معقول اور دلنشیں انداز میں کی گئی ہیں، مگر توقع کے خلاف ژولیدگیٔ فکر یہاں اور نمایاں ہے مصر میں اقامتِ دین کے علم برداروں کو لائق مصنف یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ حکومت اور نظامِ حکومت کے قیام کا مطالبہ اسلام میں مطلوب و مقصود نہیں۔ حکومت تو اللہ کی طرف سے انعام ہے۔ یہ طلب نہیں کی جاتی۔ کہنا یہی چاہتے ہیں، مگر کہتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں۔ اور اسی لیے اس موقع پر ان کے بیان میں تضاد سا رونما ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ "حکومت طلب نہیں کی جاتی۔ یہ نتیجہ کے طور پر خود بخود ظہور میں آتی ہے، جیسے ایک درخت اپنے وقت پر پھل دینا شروع کرتا ہے"۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"لیکن دعوت کے کسی مرحلے میں — دعوت کے پھیل جانے اور دل و دماغ میں جاگزیں ہو جانے کے بعد — اگر یہ کام حکومت کے بغیر ناممکن ہو، تو ہم دعوت اور دین کی خاطر اس کے لیے جدوجہد کریں گے، جیسے وضو کے لیے پانی کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن اسی ذہنیت اور اسی کردار اور پاکیزگیٔ اخلاق کے ساتھ . . . الخ الخ۔ (صفحہ ۲۴)"

لہ صفحہ ۲۱ (ملخص)

ہم گنہگار بھی دعوت کے ایک مخصوص مرحلے ہی پر تبدیلی زعامت و قیادت کی مہم شروع کرنے کے قائل ہیں، اور اسی امانت و دیانت اور خلوصِ نیت و پاکیزگیٔ اخلاق کے ساتھ، جو ایک داعیٔ حق کی خصوصیات ہیں۔ لیکن دعوت کے اصول و مبادی تو اول روز سے واضح اور روشن ہونا چاہئیں۔ پتہ نہیں، ہمارے ملک کے ایک اچھے خاصے ذی علم اور سمجھ دار طبقے کے دل و دماغ میں یہ بات کہاں سے سما گئی ہے کہ پاکستان میں تحریکِ اقامت دین کے داعی یا مصر میں "الاسلام دین و دولت" کی دعوت دینے والے حکومت کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ حصولِ جاہ و اقتدار کے لیے حکومت کی طلب یقیناً مذموم اور بدترین چیز ہے۔ لیکن اللہ رب العالمین کے قانون کو جاری و نافذ کرنے کے لیے زمام اقتدار صالحین کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرنا، اگر اسلام میں مطلوب نہیں، تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام میں کیا چیز مطلوب ہے؟ کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی نظامِ حکومت کی داغ بیل ڈالنا نہیں شروع کر دی تھی؟ اور کیا ہجرت کے پہلے ہی سال قریش کے تجارتی راستوں کی ناکہ بندی نہیں شروع کر دی تھی؟ اور مدنی زندگی کے بالکل آغاز میں یہود سے معاہدہ کس لیے ہوا تھا؟ سچ یہ ہے کہ جو حضرات اقامت دین کی جدوجہد کو اس پہلو سے صحیح نہیں خیال کرتے، وہ دانستہ یا نادانستہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ حکومت و اقتدار جاہ پرستوں اور اقتدار پسندوں کے حوالے کر کے خانقاہ میں اللہ اللہ کرنا ہی عین اسلام ہے۔ افسوس کہ زیرِ نظر پمفلٹ میں بھی اسی طریق فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔

(د) چوتھا رسالہ ڈاکٹر اقبال پر ہے اور عربی زبان میں اقبالیات پر ایک قابل قدر اضافہ لائق مصنف کا متنوع ذوق اور گوناگوں دلچسپیاں لائق رشک اور قابلِ داد ہیں۔ اس میں ایک جگہ وہ سر شیخ عبدالقادر مرحوم (مدیر مخزن) کو "الشیخ عبدالقادر" لکھ گئے ہیں، جو قلم کی چوک معلوم ہوتی ہے۔ عربی میں "الشیخ" سے مخصوص قسم کے علماء ہی کا تصور ذہن میں آسکتا ہے۔

(ہ) پانچویں پمفلٹ میں تاریخ اسلام کے مد و جزر پر اچھے اور دلنشیں انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار سے عروج و زوال اور اخلاقی مد و جزر، دونوں کے مؤثر اور مستند

واقعات درسِ عبرت کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ رسالہ موضوع بحث کے لحاظ سے مختصر، مگر اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

یہ رسالے عربی زبان میں ہیں۔ عربی زبان میں کسی کتاب کا ہونا یوں کوئی تعجب اور خاص اہمیت کی چیز نہیں۔ مگر ان رسالوں کا عربی زبان میں ہونا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف عربی کے مشاق انشا پرداز اور صاحب طرز اہل علم ہیں۔ یوں تو برصغیر پاک و ہند میں عربی جاننے والوں کی کوئی کمی نہیں، مگر لکھنے والوں کی بہت کمی ہے۔ بہرحال اس ملک میں گنتی کے جو دو چار عربی کے مستند اہل علم ہیں، ان میں مصنف کا بھی شمار ہے، بلکہ انہیں اپنے ہم چشموں میں نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان رسائل کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ عرب ملکوں کے مسلسل سفر اور طویل قیام نے ان کی زبان میں مزید جلا پیدا کر دی ہے اور ان کا طرزِ نگارش اور بھی نکھر گیا ہے۔ علی میاں (مصنف اپنے نیاز مندوں کے حلقے میں اسی مختصر اور محبوب نام سے یاد کیے جاتے ہیں) اپنی عام زندگی، معاشرت اور رہن سہن میں تو حد درجہ سادہ بلکہ متقشف واقع ہوئے ہیں، مگر انشاء و تحریر میں وہ اچھے خاصے روشن خیال، اور متجدد (ماڈرن) ہیں، اتنے متجدد کہ ان کے دیرینہ نیاز مندوں کو ان کا یہ تجدد اور روشن خیالی کھٹکتی ہے۔ زبان و انشا میں وہ جدید مصر کے پیرو اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ مصر کے اکثر نئے لکھنے والوں کی طرح وہ بھی احساس کمتری کے لیے مرکب النقص[1]، اور Against کے لیے ضد[2] استعمال کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ Inferiority complex کا ترجمہ "مرکب النقص" بالکل لفظی اور مہمل ہے۔ اسی طرح ضد کے معنی نقیض کے ہیں۔ اس سے Against کا مفہوم کسی طرح ادا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں مثالیں نمونے کے طور پر دی گئی ہیں۔ راقم اپنی زندگی اور معاشرت میں آزاد ہونے کے باوجود ادب و انشا میں بے اعتدالی و آزادی کا حامی نہیں۔ یوں متجددین کی زبان میں اسے قدامت پسندی (محافظت) سے بھی تعبیر

[1] الدعوۃ الاسلامیۃ۔ ص۲۴

[2] شاعر الاسلام۔ ص۲۲

کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ جگہ پیدائشی "ہندیت" کی پرچھائیں بھی نظر آتی ہے۔ اعوض عن اذنکم (آپ کی اجازت سے عرض کرتا ہوں) جیسا "اردو نما" فقرہ علی میاں کے قلم سے نکلنا حیرت انگیز ہے۔ شاید یہ فروگذاشت "بشریت" کی تکمیل کے لیے ہو۔ کہیں کہیں نحوی خامیاں بھی نظر آئیں، مگر ان سے کون بچ سکتا ہے؟

ان دو چار معمولی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر ان رسالوں کی زبان عربی انشا کا اچھا نمونہ ہے اور ایک ہندی نژاد کے لیے قابلِ فخر۔ اور اس کامیابی پر علی میاں، ہماری دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نوعمروں کو دین کی طرف مائل کرنے اور

خواتین میں صحیح اسلامی مزاج پیدا کرنے کے لیے

پندرہ روزہ **الحسنات** ۔رام پور۔یو۔پی

کا مسلسل مطالعہ بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے

آپ بھی تجربہ کریں

سالانہ چندہ ۶ روپے فی پرچہ ۴ آنے

پاکستان کے خریدار ان اپنی رقم دفتر اخبار کوثر گوالمنڈی لاہور بھیج کر رسالہ جاری کرائیں یا پھر وی۔پی کے لیے ہمیں لکھیں ——— "مینیجر"

لہ انحدث الی الاخوان ص۱۸